عہد نبوی ﷺ میں مسلم معاشرہ کی تشکیل

* ڈاکٹر صاحبزادہ ساجد الرحمٰن

معاشرہ انسانی روابط کی اس تنظیم کا نام ہے جس کو ہم خیال افراد نے بنایا ہو۔ ان کے مقاصد اور مفادات میں یکسانیت ہو۔ معاشرہ کی مندرجہ ذیل الفاظ میں تعریف کی گئی ہے:

''یہ انسانی روابط کا ایک کلی مرکب ہے، اس حیثیت سے کہ یہ روابط عمل سے پیدا ہوتے ہیں، جو ذرائع و مقاصد کے رشتہ سے قائم ہے''۔(۱)

یہ بات فلاسفہ نے بھی کہی، ارسطو کے اس قول کو بے حد شہرت حاصل ہوئی کہ ''انسان ایک معاشرت پسند حیوان ہے'' اور زمانہ بھی آج تک اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ انسان دوسرے کا محتاج ہے۔ انسان دوسرے انسانوں سے مستغنی نہیں ہوسکتا۔ احتیاجات فکر انسانی کے باہمی رشتوں کو مضبوط تر بناتی ہیں اور ایک سوسائٹی وجود میں آتی ہے۔ ابن خلدون اسی طرف اشارہ کرتے ہیں:

''افرادِ انسانی کا اکٹھے مل جل کر رہنا ایک ناگزیر امر ہے اور یہ وہ حقیقت ہے جسے اہل علم اس طرح بیان کرتے ہیں کہ انسان پیدائشی طور پر مدنیت پسند واقع ہوا ہے''۔(۲)

نسل انسانی کے ابتدائی دور سے لے کر آج تک معاشرہ ارتقائی منازل میں داخل تو رہا لیکن کوئی دور بھی ایسا نہیں گزرا جب معاشرتی تنظیم سے بالکلیہ گریز کیا گیا ہو، اس لیے کہ یہ انسانی فطرت و جبلت کے منافی ہے۔ یہ جو آج دنیا میں مختلف نظام ہائے فکر، ریاست و بادشاہت، جمہوریت اور مختلف تنظیمی شکلیں نظر آ رہی ہیں، ان کے پیچھے انسان کا یہی معاشرت پسندی کا جذبہ کارفرما ہے۔

---

* ایسوسی ایٹ پروفیسر/مدیر ''فکر و نظر''، ادارہ تحقیقات اسلامی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد۔

ان صفحات میں ہمارے پیش نظر جو بحث ہے وہ یہ ہے کہ مسلم معاشرہ کی تشکیل کن بنیادوں پر ہوئی اور اس کے امتیازی پہلو کیا ہیں، لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب دیگر معاشروں کی صحیح تصویر بھی ہمارے سامنے موجود ہو، لیکن یہاں ہمارے یہ صفحات اتنی لمبی تفصیل کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ ہم یہ کوشش کریں گے کہ وہ خطہ جہاں اسلام کا سورج طلوع ہوا وہاں کے معاشرتی خد و خال کو واضح کرنے کے ساتھ ساتھ اسلامی معاشرتی تبدیلیوں کو جامعیت کے ساتھ پیش کر سکیں۔

مسلم معاشرہ کی تشکیل، اصلاحی اقدامات

(قرآن وسنت میں اس کی بنیادیں)

اسلام (بعثت محمد ﷺ) سے پہلے بے شمار معاشرے وجود میں آئے۔ اگرچہ ان تمام معاشروں کے نقوش آج ہمارے سامنے پوری طرح واضح نہیں لیکن قرآن کی اس شہادت کے بعد ان کے وجود سے متعلق کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہ جاتا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ ۢ بَعْدِ نُوْحٍ وَكَفٰى بِرَبِّكَ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًاۢ بَصِيْرًا﴾ (۳)

''اور نوح کے بعد ہم نے کتنی بستیاں ہلاک کر دیں اور آپ کا پروردگار اپنے بندوں کے گناہوں سے خبیر و بصیر ہونے کے لیے کافی ہے''۔

بعثت نبی آخر الزمان علیہ الصلوٰۃ والسلام سے پہلے انبیاء کی ایک کثیر تعداد لوگوں کی اصلاح کے لیے مبعوث ہوتی رہی اور ہر دور میں ایک جماعت نے حق کی آواز پر لبیک کہی اور دوسری جماعت نے بغاوت کی راہ اختیار کی۔ یقیناً انبیاء کی اطاعت کرنے والوں نے انبیاء کی تعلیمات کی روشنی میں اپنی معاشرتی شیرازہ بندی کی ہوگی اور الٰہی اصولوں کے مطابق اعلیٰ معاشرتی قدروں کو تحفظ دیا ہوگا۔ ہمارے پیش نظر عرب اور بالخصوص سرزمین مکہ ہے جہاں آنحضرت ﷺ کی بعثت کے وقت بالعموم اعلیٰ معاشرتی قدروں کو تحفظ حاصل نہیں تھا۔ تاہم یہاں دین ابراہیمی کی کہیں نہ کہیں جھلک نظر آ جاتی ہے۔ بہت سے لوگ ایسے موجود تھے جو دین حق کی تلاش میں تھے اور آخری پیغمبر کی

بعثت کے منتظر تھے، ورقہ بن نوفل کی مثال موجود ہے، سرزمین مکہ کے معاشرتی حالات پر جب ہم نگاہ ڈالتے ہیں تو ایک معاشرتی ڈھانچہ تو یقیناً نظر آتا ہے لیکن غیر مہذب، حدود سے متجاوز اور بعض مقامات پر اوصاف حمیدہ سے نبرد آزما دکھائی دیتا ہے۔ ذیل کی سطور میں یہ واضح کرنے کی کوشش کی جائے گی کہ اسلام نے کیا ترمیمات کیں۔ کہاں رسوم جاہلیہ کا کلیۃً خاتمہ کر دیا اور کون سی وہ چیزیں ہیں جنہیں من وعن قبول کر لیا گیا۔

کسی بھی معاشرتی تنظیم میں خاندان کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ عربوں میں بھی ''خاندان'' گویا اس معاشرتی بنیاد کا تصور پوری طرح موجود تھا بلکہ خاندانی تفاخر ان کی معاشرت کا حصہ تھا۔ خاندان کی بنیاد اکثر اوقات شادی بیاہ ہی ہوتی ہے اور اس کے لیے نکاح کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ عربوں کے ہاں نسب کے لیے صرف نکاح ہی شرط نہیں تھا بلکہ سفاح سے بھی نسب ثابت ہو جاتا تھا۔

جاہلی دور میں نکاح وطلاق کے معاشرتی بندھن بھی مروج تھے۔ ان کے ہاں نکاح کی بہت سی قسمیں پائی جاتی تھیں، مثلاً آج کا مروجہ نکاح دور جاہلیہ میں بھی موجود تھا، اسے برقرار رکھا گیا، لیکن دیگر فاسد اقسام کو اسلامی شریعت میں شامل نہ کیا۔ ان اقسام میں

۱۔ نکاح شغار

۲۔ نکاح مقت

۳۔ دو بہنوں سے بیک وقت نکاح وغیرہ ہیں۔(۴)

اسی طرح شادی کے بعد علیحدگی کے سلسلے میں بعض طریقوں کو اسلامی شریعت نے قبول کیا اور بعض کو رد کر دیا۔ ''طلاق'' کا طریقہ مروج تھا لیکن اس کی تعداد مقرر نہیں تھی اور اس طرح خواتین کے ساتھ زیادتی کا یہ عمل یوں جاری رہتا کہ طلاق دی، پھر رجوع کر لیا، پھر طلاق پھر رجوع، حتیٰ کہ عدت گزارنے کے بعد بھی مرد کو یہ اختیار حاصل تھا کہ اسے اپنے پاس روک لے۔ اسلامی شریعت نے طلاق کے اصول کو تو باقی رکھا، لیکن شوہر کو تین طلاق دینے کا حق دیا اور اس کی تکمیل کے ساتھ زوجین کی تفریق بھی مکمل ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ﴾.(۵)

خلع کا اصول عربوں کے ہاں مروج تھا، اسلام نے بھی اسے قائم رکھا۔(۶) ایلاء کا اصول بھی مروج تھا

لیکن اسے وہ طلاق ہی تصور کرتے تھے، جو ایلاء کی مدت گزر جانے کے بعد واقع ہوتی تھی۔ جوان کے یہاں ایک سال مقرر تھی، کبھی اسے وہ دو سال بھی کر دیتے تھے۔ اسلام نے ایلاء کو بھی باقی رکھا، لیکن اس کے لیے چار ماہ کی مدت باقی رکھی۔ اگر یہ مدت گزر جائے اور اس کے دوران خاوند اپنی بیوی سے صحبت نہ کرے تو بعض فقہاء کے نزدیک طلاق بائن واقع ہو جاتی ہے اور بعض کے نزدیک رجعی۔ (۷)

بالکل اسی طرح عرب معاشرہ عدت کے تصور سے بھی آگاہ اور اس اصول پر عمل پیرا تھا۔ عدت گزارنے میں حکمت یہ ہے کہ اختلاط نسب کو روکنے کے لیے اس بات کا پورا یقین کر لیا جائے کہ عورت کے رحم میں بچہ تو نہیں ہے، عربوں کے ہاں بھی یہ رواج تھا کہ طلاق یا موت کے سبب شوہر عورت سے علیحدہ ہو جاتا تو اس کے لیے عدت گزارنا ضروری ہوتا تھا، موت کی صورت میں ان کے ہاں عدت کی مدت کامل ایک سال مقرر تھی۔ (۸) اسلامی شریعت نے عدت کے نظام کو قائم رکھا اور عورتوں کے مختلف حالات کے لحاظ سے باقاعدہ صورت میں ان کی مقدار کا تعین کیا، طلاق کے بعد حیض والی عورتوں کے لیے تین حیض یا طہر مقرر کیے، جس عورت کے خاوند کا انتقال ہو گیا ہو اس کی عدت چار ماہ دس دن مقرر کی، حاملہ عورت کے لیے وضع حمل تک کی مدت مقرر کی۔ جس عورت کے ساتھ خاوند نے صحبت نہ کی ہو اس پر کوئی عدت نہیں۔

عرب معاشرہ میں وصیت اور میراث کا سلسلہ بھی جاری تھا، وہ وارث اور دوسروں کو وصیت کی اجازت دیتے تھے لیکن ان کے ہاں اس کی کوئی مقدار مقرر نہیں تھی۔ اسلام نے وصیت کے اصول کو قائم رکھا اور وصیت کرنے والے کے ترکہ میں تہائی حصہ وصیت کرنے کی حد مقرر کی اور تہائی سے زیادہ وصیت کرے تو یہ وارثوں کی اجازت پر موقوف تھا۔ وصیت کی اجازت صرف ان لوگوں کے حق میں دی جن کو میراث میں سے حصہ نہیں ملتا۔ وارث کے حق میں وصیت کو دوسرے ورثاء کی اجازت پر موقوف رکھا۔ (۹)

عرب معاشرہ میں معاملات کی بہت سی اقسام بھی رواج پذیر تھیں، جن میں سے کچھ کو اسلام نے قائم رکھا اور بعض کی ممانعت کر دی۔ مثلاً عقد شرکت، عقد مضاربت، عقد سلم کو اسلام نے قائم رکھا، اور ربا اور رہن کو خلاف اسلام قرار دیا۔ (۱۰)

عرب معاشرہ میں خرید و فروخت کے جو طریقے رواج پذیر تھے، اسلام نے ان میں سے ان قسموں کو باقی

رکھا جو درست تھیں اور فریقین کی رضامندی سے طے پاتی تھیں۔ جو اقسام باہمی رضامندی کے قاعدے کے خلاف تھیں، اسلام نے انہیں باطل قرار دیا۔ مثلاً بیع منابذہ، ملامسہ، بیع حصاۃ بیع، نجش وغیرہ کو خلاف اسلام اور ناجائز قرار دیا۔

معاشرے کے لیے قانون ضروری ہے بالکل اسی طرح جیسے انسان کے لیے معاشرہ ضروری ہے۔ اس لیے کوئی معاشرہ قانون وضابطوں سے خالی نہیں تھا۔ یعنی ایسے قواعد اور ضوابط جو افراد کے آپس کے تعلقات کو منظم کریں، کبھی یہ ضابطے رسم ورواج اور عرف سے عبارت ہوتے ہیں جن کے مطابق لوگوں کے تمام کام سرانجام پاتے ہیں اور لڑائی جھگڑے کی صورت میں انہی کے مطابق فیصلے کیے جاتے ہیں۔ جاہلی دور میں عربوں کا یہی قانون تھا۔ لیکن اس رسم ورواج کے قانون میں بعض چیزیں ایسی تھیں جنہیں اسلام نے باقی وقائم رکھا اور بعض میں ترمیم واضافہ کیا۔ مثلاً قتل کی صورت میں مجرم سے قصاص عربوں کے یہاں معروف تھا لیکن وہ صرف قاتل سے قصاص لینے پر ہی اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ قبیلہ کے تمام افراد تک تجاوز کرتے گویا ان کی نظر میں پورا قبیلہ اس جرم کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ اسلام نے اس ذمہ داری کی حد بندی کی اور اس کو صرف قاتل تک محدود کر دیا۔ چنانچہ اسلام نے حکم دیا کہ قصاص صرف قاتل سے ہی لیا جائے گا۔

﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى﴾(۱۱) کا واضح اصول دے دیا گیا۔ دیت، یعنی خون بہا کا نظام بھی عربوں میں رائج تھا۔ اسلام نے اس نظام کو قائم رکھا۔ البتہ قتل خطاء کی صورت میں دیت کی ذمہ داری عاقلہ پر ڈالی، یعنی قاتل کے قبیلہ کے مرد عصبات اس دیت کے ادا کرنے کے ذمہ دار ہوں گے۔ اس کو وہ تین سال کی مدت میں ادا کر سکتے ہیں۔ اگر مقتول کے وارث راضی ہوں تو اسلام نے قتل عمد کی صورت میں بھی دیت مقرر کی ہے لیکن اس صورت میں تنہا قاتل ہی کو یہ دیت ادا کرنا ہوگی۔

حدیث طیبہ میں آتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے قسامت کے اصول کو اسی صورت میں باقی رکھا جس طرح وہ جاہلی دور میں تھا۔ قسامت سے مراد قسمیں ہیں۔ اگر کسی آبادی یا محلّہ میں مقتول کی لاش پائی جائے اور اس کے قاتل کا علم نہ ہو تو لاش کا اس آبادی میں پایا جانا اس شک وشبہ کا متقاضی ہے کہ قاتل اسی آبادی یا محلّہ کا کوئی شخص ہوگا، اس لیے مقتول کے ورثاء کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس محلّہ کے پچاس آدمیوں سے اس بات کی پچاس قسمیں

لیں کہ نہ ہم نے اس کو قتل کیا اور نہ ہمیں اس کے قاتل کا علم ہے، اگر وہ قسم کھالیں تو ان کے ذمہ دیت واجب نہ ہوگی اور اگر وہ قسم کھانے سے انکار کریں تو ان کو اس وقت تک قید میں رکھا جائے گا جب تک وہ قسم نہ کھائیں یا اقرار نہ کریں۔(۱۲)

اسلام سے پہلے عربوں کے ہاں یہ رواج تھا کہ مدعی اپنے دعوے کو درست ثابت کرنے کے لیے کوئی ثبوت پیش کرتا تھا۔ اگر ثبوت پیش کرنا اس کے لیے ممکن نہ ہوتا تھا تو وہ مدعی علیہ سے قسم لیتا۔ اسلام نے بھی اس اصول کو قائم رکھا۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''مدعی کے ذمہ بار ثبوت ہے اور جو شخص انکار کرے یعنی مدعی علیہ اس کے ذمہ قسم ہے''(۱۳)

علاوہ ازیں غلامی کا تصور، بندہ و آقا کی تمیز، نسلی و نسبی تفاخر یہ تصورات عرب معاشرہ میں بنیادی اہمیت رکھتے تھے۔ اسلام نے انسان کی اپنی پیدا کردہ تفریقات کو ختم کر کے انہیں وحدت نسل انسانی کا درس دیا اور یہ پیغام الٰہی سنایا۔

﴿یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ﴾(۱۴)

''اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا، پھر تمہیں قبائل اور گروہوں میں تقسیم کیا تا کہ تم تعارف حاصل کر سکو، یقیناً اللہ کے نزدیک عزت و احترام کا مالک وہی ہے جو تم میں زیادہ متقی ہے''۔

چنانچہ آپ ﷺ نے عرب رسم و رواج کو جہاں ختم کرنا ضروری تھا وہاں انہیں ختم کر کے جہاں ان میں ترمیم و اضافہ کی ضرورت تھی وہاں ترمیم و اضافہ کر کے اور جو محاسن تھے ان کو باقی رکھتے ہوئے اسلامی معاشرے کی بنیاد رکھی۔ ان اصولوں و قانونی ترمیمات کے بعد اسلام نے جو معاشرتی ڈھانچہ تشکیل دیا اس کے اصول و مبادی یہ ہیں:

عہدِ نبوی کے مسلم معاشرہ کے امتیازی اصول

۱۔ مساوات ۲۔ آزادی

۳۔ اخوت ۴۔ عدل

۵۔ رواداری

اب ہم ان تصورات کا علی الترتیب مختصراً طور پر جائزہ لیتے ہیں:

ا۔ مساوات

اسلام کا بنیادی اصول توحید ہے۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اسلام کی نظر میں بحیثیت انسان سارے انسان برابر ہیں۔ وحدت انسانیت کا تصور وحدت خداوندی کے تصور سے خود بخود لازم آتا ہے۔ خدا کی ہدایت قدرتی طور پر ہمیں انسانیت کی وحدت کی طرف لے جاتی ہے، خالص توحید کا تصور اس وقت تک بے معنی ہے جب تک یہ سارے انسانوں کی مساوات کو مستلزم نہ ہو۔ عملاً توحید کے جوہر میں مساوات، اخوت اور آزادی داخل ہیں۔ قانون کے لحاظ سے سارے مسلمان برابر ہیں۔ خواہ وہ کسی رنگ، علاقہ یا نسل سے تعلق رکھتے ہوں۔ قانون کے نفاذ میں کسی امتیاز کو ملحوظ نہیں رکھا جا سکتا۔ اپنی شخصی و انفرادی ترقی کے لیے ہر شخص کو برابر مواقع ملنے چاہئیں۔ قابلیت معیار ہے، رنگ و نسل کے امتیازات معیار نہیں۔ اسلام میں یہودیوں کی طرح کوئی منتخب گروہ نہیں ہے۔ اس لیے اسلام میں رہبانیت یا پاپائیت کے لیے بھی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ خدا کی نظر میں محبوب ترین انسان وہ ہے جو تقویٰ میں بڑھا ہوا ہے۔ قرآن مجید واضح لفظوں میں کہتا ہے:

﴿اِنَّ اَکۡرَمَکُمۡ عِنۡدَ اللّٰہِ اَتۡقٰکُمۡ﴾(۱۵)

''خدا کے نزدیک تم میں سے سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہے''۔

﴿وَلِکُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوۡا. وَمَا رَبُّکَ بِغَافِلٍ عَمَّا یَعۡمَلُوۡنَ﴾(۱۶)

''ہر ایک کے لیے درجے ہیں جو انہوں نے عمل کیا، اور تمہارا رب اس سے غافل نہیں ہے، جو تم عمل کرتے ہو''۔

﴿وَلِکُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوۡا. وَلِیُوَفِّیَہُمۡ اَعۡمَالَہُمۡ وَہُمۡ لَا یُظۡلَمُوۡنَ﴾(۱۷)

''ہر ایک کے لیے درجے ہیں جو انہوں نے عمل کیا، تاکہ خدا ان کو ان کے اعمال کا پورا

بدلہ دے اوران پر کوئی ظلم نہ ہوگا''۔

دنیا میں نیک بن کر زندگی گزارنا سب سے بڑی عبادت ہے۔ یہ اسلام کی اسی مساوات کا تصور تھا جس سے ان غلاموں نے جن کے ساتھ بے جان مشینوں کا سا سلوک کیا جاتا تھا، ایسی ترقی کی کہ ریاست کے حاکم تک بن گئے اور عورتیں جن کی حیثیت قابل خرید وفروخت اشیاء کی سی تھی اور جن کو مال منقولہ سمجھا جاتا تھا، ان کو ایک محترم مقام حاصل ہوگیا۔

۲۔ آزادی

ایک مسلمان کو اس بارے میں پوری آزادی حاصل ہے کہ وہ سوائے خدا کے کسی کی اطاعت نہ کرے۔ قانون الٰہی اور نظام الٰہی کے سامنے جھک جانا ایک فرد کو ہر ایک کی غلامی سے آزادی دلاتا ہے۔ آزادی کا مقصد بے عنان ہونا نہیں ہے۔ اسلام میں ہر فرد کو اپنے حقوق سے فائدہ اٹھانے کی اس حد تک آزادی ہے کہ وہ شریعت کے مقرر کردہ حدود میں رہے اور دوسرے کے حقوق پر دست درازی نہ کرے۔ خدا کا حکم اس کے ضمیر کے لیے معاشرہ سے بلند تر نگران کی حیثیت رکھتا ہے۔ اپنے تمام اعمال کا وہ خود ذمہ دار ہے۔ قرآن مجید صاف صاف یہ اعلان کرتا ہے کہ ایک شخص دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔(۱۸)

۳۔ اخوت

اخوت اسلام کا جوہر ہے۔ قرآن مجید کا کہنا ہے:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ﴾(۱۹) ''مسلمان بھائی بھائی ہیں''۔

مسلمان ایک ہی برادری کے ارکان ہیں۔ بنیادی انسانی حقوق کے اعتبار سے ان میں کوئی امتیاز نہیں کیا جاتا، وہ عقیدہ کی بنیاد پر رشتہ اخوت میں پرو دیئے گئے ہیں۔ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے:

''ایک مومن دوسرے مومن کے لیے عمارت کی مانند ہے کہ ایک حصہ دوسرے کو مضبوط کرتا ہے''۔(۲۰)

اسلامی اخوت کو جو قوت حاصل ہے وہ خونی رشتہ کو بھی نہیں، ایک مسلمان کا کسی غیر مسلم سے خونی رشتہ ہونے کے باوجود اس کی شہریت دوسرے غیر مسلم رشتہ دار سے الگ سمجھی گئی۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مسلمانوں نے اپنے باپ اور بیٹوں کے خلاف جنگ کی اور آنحضرت ﷺ نے اپنے وطن مکہ پر حملہ کیا۔ اپنے عزیز رشتہ داروں کے خلاف جہاد کیا۔

اسلامی اخوت اس وقت پھلی پھولی جب آنحضرت ﷺ نے مہاجرین وانصار کا آپس میں بھائی چارہ کرایا اور وہ بھائیوں کی طرح آپس میں مل کر زندگی گزارنے لگے۔ اس بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر عالم گیر ہے، اور اسلام ایک عالم گیر اسلامی اخوت قائم کرنا چاہتا ہے۔

عدل

یہ اجتماعی عدل ہی تھا جس کے لیے آنحضرت ﷺ انتہائی فکرمند تھے اس لیے ابتدائی اور مکی سورتوں میں عدل کا کثرت سے ذکر ہے۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل آیتیں ملاحظہ ہوں:

۱. ﴿قُلْ اَمَرَ رَبِّیْ بِالْقِسْطِ﴾(۲۱)

''کہو کہ میرے رب نے انصاف کا حکم دیا ہے''۔

۲. ﴿وَاَوْفُوا الْکَیْلَ وَالْمِیْزَانَ بِالْقِسْطِ﴾(۲۲)

''اور ناپ تول کو انصاف سے پورا کرو''۔

۳۔ ﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْکِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾(۲۳)

''بے شک ہم نے اپنے رسول نشانیوں کے ساتھ بھیجے اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان کو نازل کیا تاکہ لوگ انصاف کو قائم کریں''۔

۴. ﴿اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ﴾(۲۴)

''بے شک اللہ تعالیٰ انصاف اور نیکی کرنے کا حکم دیتا ہے''۔

۵. ﴿وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا﴾(۲۵)

''جب تم کچھ کہو تو انصاف کرو''۔

عدل برابری اور غیر جانب داری کے ساتھ انصاف کرنا ہے۔ کسی شخص کی عزت واحترام کا اس میں لحاظ نہ رکھا جائے۔ ایجابی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ طاقت ور کے مقابلہ میں کمزور کی حفاظت کی جائے اور منفی طور پر انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ جرائم کو روکے۔ مظلومین کے حقوق دلائے اور مفسدین کو سزا دے۔ اسلام خدا کی حکومت زمین پر قائم کرنا چاہتا ہے اور انسان پر انسان کے ظلم کو روکتا ہے اور انسانوں کے ساتھ انسانیت دشمنی کو ختم کرتا ہے۔ فلاح عام کے لیے انصاف انتہائی ضروری ہے۔

۵۔ رواداری

اسلامی حکومت میں اسلام ہر مذہب وفرقہ سے تعلق رکھنے والوں کے ضمیر اور عبادت کی آزادی کا ضامن ہے۔ قرآن مجید کی یہ آیت ﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ﴾(۲۶) ''یعنی دین میں جبر نہیں ہے'' وہی رواداری کا اصول بیان کر رہی ہے جو اسلام اپنے ماننے والوں میں پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اس اصول کے ماتحت تمام مذاہب اسلام کے ساتھ مکمل آزادی سے رہ سکتے ہیں۔ اسلامی نظامِ فکر دوسرے مذاہب کو نہ صرف مکمل آزادی دیتا ہے بلکہ اجتماعی و سیاسی حدود میں ان کی حفاظت کرتا ہے۔ اسلام انسانیت کو رواداری کی بنیاد پر متحد کرنے کے لیے قوی ترین عامل ہے۔ اسلام خلاف عقل عداوتوں کو ختم کرنا چاہتا ہے اور عالمگیر خیر سگالی اور باہمی محبت کو فروغ دینا چاہتا ہے۔ اسلام امن کی ایک سرمدی دعوت ہے۔ اسلام غیر مسلم اقوام کے ساتھ رواداری کے درجہ سے آگے بڑھ کر ''ذمہ داری'' کا فریضہ عائد کرتا ہے۔

معاشرتی مقاصد کی تکمیل کے لیے ادارے

اسلامی معاشرہ کے مندرجہ ذیل ادارے اس کے مقاصد کو پورا کرتے ہیں:

۱۔ عبادات ۲۔ خاندان

۳۔ ریاست ۴۔ اقتصادی نظام

عبادات

عبادات یا مذہبی فرائض، اسلامی معاشرہ کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ اسلام میں مندرجہ ذیل اعمال عبادات کہلاتے ہیں:

۱۔ نماز ۲۔ رمضان کے مہینہ کے روزے
۳۔ زکوٰۃ ۴۔ حج بیت اللہ
۵۔ اور دیگر نفلی عبادات

اُمت اسلامیہ کے ڈھانچے میں عبادات کی حیثیت ایک بنیادی پتھر کی سی ہے۔ اسی لیے ان کو بجا طور پر اسلام کے پانچ ستون کہا جاتا ہے۔ تزکیہ نفس اور روحانی فوائد کے علاوہ عبادات مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے لیے ایک قومی عامل ہیں اور معاشرہ میں ان سے وحدت، استحکام اور قوت پیدا ہوتی ہے۔ نمازوں سے اخلاقی چلن بنانے، مشکلات پر قابو پانے اور دوسرے کے ساتھ نیکی کرنے میں مدد ملتی ہے۔ روزہ سے انسان اعلیٰ درجہ کی تہذیب نفس حاصل کرتا ہے اور خود پر قابو پا سکتا ہے۔ زکوٰۃ ایک لازمی اجتماعی بھلائی کی اسکیم کا کام کرتی ہے اور چند ہاتھوں میں دولت جمع ہونے سے روکتی ہے۔ حج بیت اللہ سے خالص اسلامیت اور عالم گیر اسلامی برادری کے قیام میں مدد ملتی ہے۔ عبادات تقویٰ کا سنگ بنیاد ہیں جو اسلام کی کسوٹی ہے۔

خاندان

خاندان اسلامی معاشرہ کی بنیادی وحدت ہے۔ یہی اسلامی اخلاق و عادات کی تربیت اور اجتماعی تنظیم کا مرکز ہے۔ قرآن مجید مسلسل افراد خاندان کو ان کے فرائض یاد دلاتا ہے۔ (۲۷) عائلی زندگی میں محبت ہم آہنگی اور انصاف جیسی صفات ناگزیر ہیں۔ خاندان کو بہت سی امانتیں سونپی گئی ہیں۔ (۲۸) والدین کے ساتھ رحم کا سلوک۔ (۲۹) عورتوں کے ساتھ مہربانی و شفقت اور یتیموں، حاجت مندوں، ذمیوں اور غلاموں کے ساتھ انسانی

برتاؤ کرنا اسلامی معاشرہ کی خصوصیات ہیں۔(۳۰) جنسی روابط شریعت کی حدود میں رکھے جائیں۔ مرد کے ذمہ خاندان کے لیے کمانا اور روزی کا انتظام کرنا۔ جسمانی ساخت کے اعتبار سے مرد عورت پر فوقیت رکھتا ہے۔ اس لیے اسلام نے مرد کو عورت پر فوقیت دی ہے۔ قانون میراث اور شہادت میں ایک مرد کو دو عورتوں کے برابر سمجھا گیا ہے۔ لیکن اس کمی کو دوسرے ذرائع سے پورا کیا گیا۔ مثلاً جہیز کا حق پورا اسی کو پہنچتا ہے۔ ماں یا بیٹی اور گھر کے معاملات میں بیوی کی حیثیت سے اس کو خصوصی مقام حاصل ہے۔ ورنہ مرد اور عورت دونوں حقوق و فرائض میں برابر ہیں۔ دونوں فریقین میں نکاح کے ذریعہ اجتماعی و معاشرتی تعلق پیدا ہوتا ہے۔

اسلامی ریاست

اسلامی ریاست میں سارا اقتدار خدا اور اس کے رسول کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ اسلام قیصر اور پوپ دونوں کی حکومتوں کو یکجا جمع کرتا ہے۔ مظہر الدین صدیقی لکھتے ہیں:

> ''اسلام میں ریاست اور مذہبی امور ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں اور ان دونوں میں امتیاز اس وقت سے اٹھ گیا جب رسول اللہ ﷺ نے مدینہ کی باگ دوڑ اپنے ہاتھ میں لی اور آئندہ آنے والے نظام کا تعین ہوا''۔(۳۱)

ریاست کے پیچھے اسلام کا ایک خاص نظام فکر کارفرما ہے۔ اشتراکیت کی طرح یہ بھی نئی ریاست کی پالیسی اور دستور وضع کرتا ہے۔(۳۲) قانون خداوندی کو دنیا میں نافذ کرنے کے لیے اسلام کو سیاسی اقتدار کی ضرورت ہے۔ اسلامی ریاست پادریوں کی حکومت نہیں ہے۔ اس کے لیے مذہب وجمہوری ریاست یا ایک فلاحی مملکت کی اصطلاح زیادہ مناسب ہے۔ یہ دونوں اصطلاحیں جمہوری اور آمرانہ نظاموں کے بین بین ہیں۔ اس ریاست کے باشندے پورے طور پر آزاد ہوتے ہیں لیکن خدا کے غلام حتیٰ کہ رئیس مملکت بھی قانون الٰہی کے تابع ہوتا ہے۔

معاشی نظام

اقتصادی امور کو باضابطہ بنانے کے لیے اسلام نے واضح افادی اور مساویانہ اصول و معیار مقرر کیے ہیں۔ اسلام انفرادی ملکیت، کسب و معاش کے لیے انفرادی کوشش، زکوٰۃ، صدقات اور اجرت کی فوری ادائیگی کے حق

میں ہے۔ دولت کے ارتکاز، سود، مال کو گراں فروشی کی نیت سے روکنے اور زمین کی غیر منصفانہ تقسیم کے خلاف ہے۔ زکوٰۃ ایک اجتماعی فلاحی نظام ہے۔

قانون

اسلام کے لفظی معنی خدا کے حکم کے سامنے جھک جانا ہے۔ یہاں خدا کے حکم سے مراد شریعت ہے۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی لکھتے ہیں:

''مغرب میں قانون اقتدار اعلیٰ کی منشاء کا نام ہے لیکن اسلامی ملکوں میں قانون خدا کی مرضی کا نام ہے''۔

شریعت احکام و فرائض کے مجموعہ یا مسلمانوں کے لیے ایک مثالی لائحہ عمل کو کہتے ہیں۔ جس میں ان کی زندگی کے ہر پہلو کا لحاظ رکھا گیا ہے یعنی اجتماعی، سیاسی اور اقتصادی۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب لکھتے ہیں:

''شریعت امت مسلمہ کا دستور ہے''۔

متاخر دور کے علماء نے اجتہاد کے دروازے کو باوجود مسلسل ترقی و تمدن کے بند کر دیا۔ ڈاکٹر محمد اقبالؒ نے اسلامی قانون کے متحرک مزاج کو نہایت فاضلانہ انداز میں اپنی کتاب ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' میں پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اسلامی قانون کے غیر متبدل پہلو کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

''تمام اسلامی ملکوں میں اس کا اعتراف کیا جا رہا ہے کہ شریعت کے تبدیلی پذیر حصہ میں بہت کچھ تغیر کی ضرورت ہے اور اس کا وہ حصہ جس میں تبدیلی نہیں کی جا سکتی، تعبیر نو چاہتا ہے''۔

اسلامی قانون بنیادی طور پر بلاشبہ مکمل ہے اور اس میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں۔ جیسا ماضی میں تھا وہی آج ہے اور آئندہ بلکہ ہمیشہ ایسا ہی رہے گا۔ لیکن اس کی تعبیر نامکمل انسان اپنی نسبتوں اپنی ضرورتوں اور اپنے حالات کے پیش نظر کرتے رہیں گے۔ اسلام ایک ایسا راستہ ہے جو افراد میں اخلاقی اقدار کے لیے ردعمل پیدا کرتا ہے۔ یہ ردعمل حالات کے اختلاف سے بدلتا رہتا ہے اور اس دائمی رہنے والے قانون کی مسلسل تبدیل ہونے

والے حالات میں مریض انسانیت کی صحت کے لیے کام کرتا ہے۔ اجتہاد کا دروازہ جو صدیوں سے بند ہے، اس کو کھولنے کے لیے اخلاقی کوشش کی ضرورت ہے جو وقت کا سب سے بڑا اہم تقاضا ہے۔

بہبود عامہ اسلامی معاشرتی تنظیم کی بنیاد اور محور ہے، اس لیے ہم اسے الگ سے زیر بحث لا رہے ہیں۔

اسلامی معاشرہ اور بہبود عامہ

اسلام میں حقوق اللہ اور حقوق العباد کا حسین امتزاج ہے۔ اسلام میں نماز سب سے بڑی عبادت ہے۔ لیکن قرآن حکیم نے ایسے نمازیوں کو ہلاکت کی وعید سنائی ہے جو نماز کو محض قیام، رکوع، سجود تک محدود رکھتے ہیں اور اذہان وقلوب میں للّٰہیت وخشیت پیدا کر کے دکھی انسانیت کو اس کے مصائب وآلام سے نجات نہیں دلاتے۔

﴿الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ﴾(۳۳)

''ایسے نمازیوں کے لیے ہلاکت ہے جو اپنی نماز سے بے خبر ہیں، جو ریاکاری کرتے ہیں اور اشیائے ضرورت کو روکتے ہیں''۔

معاشرتی بہبود کا بنیادی مقصد معاشرے کے محتاجوں، بیکسوں، معذوروں، بیماروں، بیواؤں اور بے سہارا لوگوں کی دیکھ بھال اور ان کی فلاح و بہبود ہے۔ یہ مقصد بہتر طور پر اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ ایسے لوگوں کی ضرورت اور معذوری دور کر کے معاشرے میں تمول و احتیاج اور دولت وضرورت کے درمیان توازن پیدا کیا جائے۔ جو لوگ ملک سے غربت وافلاس اور ضرورت واحتیاج دور کرنے کے لیے اپنا مال و دولت خرچ کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے خرچ کو اپنے ذمے قرض حسنہ قرار دیتے ہیں۔ ساتھ ہی اس بات کی ضمانت بھی دیتے ہیں کہ اس کی ادائیگی کے وقت اسے دوگنا کر دیا جائے گا۔ مزید یہ کہ قرض دینے والوں کو اجر عظیم عطا ہوگا۔

﴿ اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ﴾(۳۴)

''جو لوگ خیرات کرنے والے ہیں۔ مرد بھی اور عورتیں بھی اور اللہ کو قرض حسنہ دیتے ہیں، ان کو دوگنا ادا کیا جائے گا اور ان کے لیے اجر کریم ہے''۔

مخلص اور نیک دل انسان اپنا مال و دولت بے غرض اور بے لوث خرچ کرتے ہیں۔ اس میں وہ اتنے نیک نیت ہوتے ہیں کہ وہ اس خرچ کے عوض محتاجوں اور بیکسوں سے کسی قسم کے بدلہ اور جزاء کے خواستگار نہیں ہوتے بلکہ وہ کہتے ہیں:

﴿اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا﴾(۳۵)

''ہم جو تمہیں کھلاتے ہیں جو خالص اللہ کے لیے ایسا کرتے ہیں، ہم تم سے نہ بدلہ چاہتے ہیں اور نہ شکرگزاری''۔

جو مال دار اور دولت مند اپنے مال و دولت کو معاشرتی بہبود پر خرچ نہیں کرتے اور اپنا مال عیش و عشرت پر لٹاتے ہیں اور بینکوں اور خزانوں میں جمع کر کے ملکی دولت کو منجمد کرتے ہیں، وہ اللہ کے غیظ و غضب کو دعوت دیتے ہیں اور دولت و کنز کے عوض جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ خریدتے ہیں:

﴿وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ. هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ﴾. (۳۶)

''جو لوگ سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، انہیں اس دن کے دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دو۔ جس دن وہ (مال) دوزخ کی آگ میں گرم کیا جائے گا، پھر اس سے ان کی پیشانیوں اور ان کے پہلو اور ان کی پیٹھیں داغی جائیں گی (اور کہا جائے گا کہ) یہ وہی ہے جو تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا سو جو تم جمع کرتے تھے (اب) اس کا مزہ چکھو''۔

اسوہ رسول ﷺ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانیت کی فلاح و بہبود بالخصوص دکھی، مصیبت زدہ، مفلوک الحال اور مفلس و محتاج لوگوں کو باعزت زندگی گزارنے کے قابل بنانا آپ کی بعثت کے اعلیٰ مقاصد میں شامل تھا۔ بخاری اور مسلم کی متفقہ روایت کے مطابق آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

((الساعی علی الارملة والمسکین کالقائم لا یفترو کالصائم لا یفطر))(۳۷)

''بیواؤں اور مسکینوں کی مصیبتوں کو دور کرنے میں کوشاں شخص اجر وثواب میں اس شخص کے برابر ہے جو ہمیشہ نماز میں مصروف رہتا ہے اور اس میں کوئی وقفہ نہیں کرتا اور ہمیشہ روزہ رکھتا ہے اور کبھی افطار نہیں کرتا''۔

بخاری شریف کی ایک روایت کے مطابق آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

''میں اور یتیم و بے کس کی کفالت کرنے والا جنت میں ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح ہوں گے، جس طرح انگشت شہادت اور بیچ کی انگلی ایک دوسرے کے ساتھ ہیں''

ابوداؤد اور ترمذی کی روایت کے مطابق نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((الراحمون یرحمهم الرحمن ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء))(۳۸)

''جو لوگ دوسروں پر رحم کرتے ہیں، رحمٰن ان پر رحم کرتا ہے، اہل زمین پر رحم کرو، آسمان والا تم پر رحم کرے گا''۔

بیکسوں، مفلسوں اور محتاجوں پر رحم نہ کرنے والے رحمۃ للعالمین کی شفاعت سے محروم ہوں گے۔ رحمت دو عالم ﷺ نے ایسے انسانوں کو اپنی امت سے خارج فرما دیا ہے جو بچوں پر رحم نہیں کرتے، بزرگوں کی عزت نہیں کرتے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

((لیس منا من لم یرحم صغیرنا ولم یؤقر کبیرنا))(۳۹)

''وہ لوگ ہم میں سے نہیں جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہیں کرتے اور ہمارے بڑوں کی عزت نہیں کرتے''۔

آنحضرت ﷺ قبل از نبوت مکہ کے ظالمانہ ماحول میں بھی سخت نامساعد حالات کے باوجود چالیس برس

تک مسلسل غرباء وفقراء اور محروم ومعدوم کی خدمت میں مصروف رہے اور اپنی بساط کے مطابق ان کی امداد واعانت فرماتے رہے۔ اس سلسلے میں آپ کے لائحہ عمل اور سیرت وکردار کی جو مستند ترین روایت ہم تک پہنچی ہے، اگر مسلمان اسے اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اپنالیں تو نہ صرف اسلامی دنیا جنت نظیر بن سکتی ہے بلکہ پوری دنیا آنحضرت ﷺ کو صحیح معنوں میں رحمت دوعالم ماننے پر مجبور ہوسکتی ہے۔

آپ کی چالیس سالہ قبل از نبوت معاشرتی بہبود کی حکمت عملی کا تذکرہ حضرت خدیجہ الکبریٰؓ کے ذریعے ہم تک پہنچا ہے۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ نے اس روایت کا پس منظر بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ غارِ حرا میں تشریف فرما تھے، جبرائیل امین آپ کے پاس آئے اور آپ کو وحی ونبوت سے سرفراز فرمایا۔ اس واقعہ سے متاثر آپ گھر تشریف لائے اور حضرت خدیجہؓ سے اپنی حیرت وپریشانی کا ذکر فرمایا۔ حضرت خدیجہؓ بڑی عقل مند اور بالغ نظر خاتون تھیں، تجارت ودیگر دنیوی امور میں تجربہ ومہارت کے سبب آپ کو معاشرت ومعیشت، تہذیب وتمدن اور مذہب وسیاست کے مطالعے کا کافی موقع ملا تھا۔ آنحضرت ﷺ سے حیرت وپریشانی کا ذکر سن کر آپ نے آنحضرت ﷺ کی سابقہ زندگی کے حالات پر جو تبصرہ کیا وہ تاریخ عالم میں سنہری حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے۔ یہی تبصرہ حضور کی معاشرتی بہبود کی حکمت عملی کا تذکرہ ہے۔ بخاری شریف کی کتاب الوحی میں اسے ان الفاظ میں نقل کیا گیا ہے:

((فقال لخديجة و اخبرها الخبر (لقد خشيت على نفسى) فقالت خديجة كلا والله ما يخزيك الله ابدا انك لتصل الرحم و تحمل الكل و تكسب المعدوم و تقرى الضيف و تعين على نوائب الحق))(۴۰)

آپ ﷺ نے خدیجہؓ کو واقعے کی خبر سنائی اور کہا کہ مجھے کچھ گھبراہٹ سی ہو رہی ہے۔ خدیجہؓ نے کہا، ہرگز نہیں۔ خدا کی قسم اللہ آپ کو رسوا نہیں کرے گا۔ کیونکہ آپ:

۱۔ تعلقات جوڑتے ہیں۔

۲۔ ناتواں کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔

۳۔ جو چیز دوسروں کے پاس نہیں آپ انہیں کما کر دیتے ہیں۔

۴۔ مہمانوں کی مہمان نوازی کرتے ہیں۔

۵۔ حادثات کے شکار لوگوں کے حقوق دلانے میں مدد کرتے ہیں۔

حضرت خدیجہؓ نے اپنی حکمت و دانائی سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اعزہ و اقارب سے نیک سلوک کرنا، انسانی تعلقات استوار کرنا، بیکس و ناتواں کے مسائل و مصائب خود اپنے سر لینا ''محروم و معدوم'' کو خود کما کر دینا، مہمان نوازی کرنا، حادثات و مقدمات میں حق دار کو حق دلانے میں مدد دینا، عالمگیر اصول ہیں۔ انسانیت کی فلاح و معاشرت و تمدن کی بہبود کا انحصار انہی پر ہے۔ سورۃ بقرہ کی آیت ۱۷۷ اسلامی عقائد و عبادات اور معاشرتی فلاح و بہبود کا عالمگیر چارٹر ہے:

﴿لَيْسَ الْبِرَّ أَن تُوَلُّواْ وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَـكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللّهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ وَالْمَلآئِكَةِ وَالْكِتـبِ وَالنَّبِيِّيْنَ وَآتَى الْمَالَ عَلَى حُبِّهِ ذَوِيْ الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامَ الصَّلٰوةَ وَآتَى الزَّكٰوةَ وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُواْ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَأْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَأْسِ أُولـٰئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوا وَأُولـٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ﴾(۴۱)

''نیکی یہ نہیں کہ تم مشرق و مغرب کی طرف اپنا منہ کرلو بلکہ نیکی یہ ہے کہ لوگ خدا پر، یوم آخرت پر، فرشتوں پر، کتاب پر اور پیغمبروں پر ایمان لائیں اور اس کی محبت پر اپنا مال عزیزوں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، سائلوں کو دیں اور گردنیں چھڑانے پر خرچ کریں اور نماز پڑھیں، زکوٰۃ دیں، جب عہد کریں تو اسے پورا کریں۔ سختی اور تکلیف میں اور (معرکہ) کارزار کے وقت ثابت قدم رہیں۔ یہی لوگ ہیں جو ایمان میں سچے ہیں اور یہی ہیں جو خدا سے ڈرنے والے ہیں''۔

انسانی فوز و فلاح کے اس چارٹر کے مطابق اصل نیکی اور بھلائی یہ ہے کہ انسان ایمانیات کے نتیجے میں اپنے مال و دولت کے ساتھ محبت اور رغبت کے باوجود اسے معاشرتی بہبود کے کاموں پر خرچ کرے۔

اسلام کے نظام معاشرتی بہبود اور اسلام کی روحانی اور اخلاقی اقدار میں گہرا تعلق ہے۔ اسلام کی یہ اقدار انسان کو ایثار، قربانی اور بے لوث خدمت خلق پر آمادہ کرتی ہیں اور وہ اپنے ضرورت مند بھائیوں کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے پر روحانی خوشی محسوس کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں انصارِ مدینہ کا ایثار تاریخ میں ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی بے لوث خدمات کو دوام بخشنے کے لیے ان کا ذکر اپنی ابدی کتاب کتاب قرآن حکیم میں فرمایا ہے:

﴿ وَ يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾.(۴۲)

''انصار مدینہ مہاجرین مکہ کو اپنی جانوں سے مقدم رکھتے ہیں خواہ ان کو خود احتیاج ہی ہو''

اسلام آخری اور مکمل دین ہے۔ اس لیے اس نے ہر قسم کے انسانوں کی فطرت کے مطابق ہدایت فرمائی ہے۔ بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے لیے روحانی اور اخلاقی اقدار کے ساتھ قانونی اور انتظامی ضابطوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اس ضرورت کے پیش نظر اسلام میں ے اخلاقی و قانونی ضابطوں کے درمیان حسین امتزاج کیا گیا ہے۔ معاشرتی بہبود کے بنیادی اصول سورہ بقرہ کی آیت ۱۷۷ میں بیان ہوئے۔ انہی اصولوں کو عہدِ رسالت کے آخر میں قانونی حیثیت دے کر حکومت اسلامیہ کی باضابطہ حکمت عملی قرار دیا گیا:

﴿اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ.فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ. وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ﴾(۴۳)

''صدقات (زکوٰۃ) تو فقراء، مساکین، کارکنان صدقات کا حق ہے اور ان لوگوں کا جن کی تالیف قلوب منظور ہے اور غلاموں کو آزاد کرانے میں اور قرضداروں (کے قرض ادا کرنے میں) اور اللہ کی راہ میں اور مسافروں کی مدد میں (یہ مال خرچ کرنا چاہیے) یہ اللہ کی طرف سے فریضہ ہے، اللہ جاننے والا اور حکمت والا ہے''۔

اس آیت میں ہر قسم کے بے کس، مجبور، محتاج، غریب اور بے سہارا لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے جو اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں، وہ اپنی جامعیت اور استیعاب میں تاریخی عوامل کے تحت ہر زمانے میں

رونما ہونے والے فقر واحتیاج اور بیکسی و بیچارگی پر حاوی ہیں:

الفقراء: وہ لوگ جو معاشی واقتصادی طور پر بالکل تباہ حال ہوں اور ان کے پاس کچھ نہ ہو۔

المساکین: وہ لوگ جن کے پاس کچھ نہ کچھ ہو مگر انہیں بقدر حاجت میسر نہ ہو۔

فی الرقاب: وہ لوگ جن کی گردنیں غلامی، قرض یا دشمنی کی قید کے پھندے میں پھنسی ہوئی ہوں

الغارمین: وہ لوگ جو دیوالیہ ہو جائیں یا قرض دار اور تاوان جیسے حادثات کا شکار ہوں یا ضمانت وغیرہ کے بارے میں دب گئے ہوں۔

فی سبیل اللہ: وہ لوگ جو جہاد کے سامان حرب کی قدرت نہ رکھتے ہوں، غربت کے سبب تعلیم حاصل نہ کر سکتے ہوں اور افلاس کی وجہ سے علاج نہ کروا سکتے ہوں۔

ابن سبیل: وہ لوگ جو اپنے ضروری سفر پر قادر نہ ہوں یا دورانِ سفر اس قابل نہ رہے ہوں۔

فقر ومسکنت، رقبت وغرامت، غربت ومسافرت جیسی مجبوریوں اور معذوریوں کے انسداد کے لیے عہد رسالت میں جو حکمت عملی وضع کی گئی ابن سید الناس نے اس کی تفصیل اپنی کتاب ''عیون الاثر'' میں بیان کی ہے۔ ان کے مطابق آنحضرت ﷺ نے ہر قبیلے میں اپنا ایک عامل مقرر فرمایا، جو اس قبیلے کے محتاجوں اور معذوروں کی فہرست تیار کرتا اور وہاں کے خوشحال ومتمول لوگوں سے جمع ہونے والی زکوٰۃ اور خیرات کو ان کے محتاجوں ومعذوروں پر لوٹا دیتا۔

((تؤخذ من اغنیائھم فترد علی فقرائھم))

''اس طرح وہ انہیں فقر وفاقہ پر قابو پانے میں مدد دیتا''۔

اس حکمت عملی سے محتاج ومعذور بتدریج آسودہ حال اور خود کفیل ہونے لگتے اور تھوڑے ہی عرصہ میں وہ مستقل ذریعہ معاش حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے۔

اسلامی معاشرہ اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر

امر بالمعروف ونہی عن المنکر امت مسلمہ کی وہ صفت ہے جو اسے خداوند قدوس کی جانب سے عطا ہوئی ہے۔ اس دین کے پیروکار اپنی اصلاح کے بعد اپنی ذمہ داری سے سبکدوش نہیں ہو جاتے بلکہ ان کے دائرہ اصلاح

میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ ذیل میں معاشرتی فلاح کے ضمن میں اس کے اہم شعبے کو زیر بحث لایا جا رہا ہے۔

قرآن مجید اچھائی اور برائی کے لیے اکثر یہ دو اصطلاحات استعمال کرتا ہے۔ ایک معروف اور دوسری منکر۔ عربی زبان کی مشہور لغت لسان العرب میں معروف کے یہ معنی دیئے گئے ہیں:

((کل ما تعرفه النفس من الخیر و تبساء به و تطمئن الیه))

''ہر وہ اچھی چیز جسے نفس جانتا ہے، اسے پسند کرتا ہے اور اس سے اسے اطمینان ہوتا ہے''

اور اس کی جو چیز ضد ہوگی وہ منکر ہے۔ عربی لغت میں معروف کی اس طرح تشریح کی گئی ہے۔

''معروف دلالت کرتا ہے فراخ دلی یا فیاضی پر اگر وہ اعتدال کے اندر رہے۔ یا وہ صحیح منصفانہ مقصد کے لیے ہو۔ نیز پر خلوص اور ایمان دارانہ نصیحت، رائے اور عمل پر۔ اور اپنے خاندان اور نوع انسانی میں دوسروں کے ساتھ حسن سلوک پر۔ اور ہر عمل اور کام پر جس کی اچھائی دلیل یا قانون سے معلوم و ثابت ہے''۔

منکر کے یہ معنی دیئے گئے ہیں:

''معروف کے برعکس ہر وہ فعل جسے صحت مند دماغ ناپسند کریں یا اس کی اجازت نہ دیں۔ یا وہ فعل برا، خراب، قابل نفرت، مکروہ، فاسد، نامناسب، گندہ یا وحشت ناک سمجھا جائے، یا اسے ایسا قرار دیا جائے یا قانون اسے ایسا بتائے، کیونکہ اس کے بارے میں دماغ یہی سوچتا ہے''۔

قرآن مجید نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کئی مقامات پر ذکر کیا ہے۔ قرآن کا مومنوں کو ارشاد ہے کہ وہ معروف کا حکم دیں اور منکر سے روکیں۔ سورہ آل عمران میں ہے:

﴿وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَأُوْلَـٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ﴾(۴۴)

''اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونی ضرور ہے کہ خیر کی طرف بلایا کریں اور نیک کام

کرنے کو کہا کریں اور برے کاموں سے روکا کریں اور ایسے لوگ پورے کامیاب ہوں گے اور تم لوگ ان لوگوں کی طرح مت ہو جانا، جنہوں نے باہم تفریق کر لی اور باہم اختلاف کر لیا ان کے پاس احکام واضح پہنچنے کے بعد''۔

اب یہ کہ امر بالمعروف یا نہی عن المنکر کے حکم کے مخاطب سب ہیں یا امت کا ایک مخصوص گروہ۔ اس بارے میں مفسرین میں اختلاف ہے اور اس اختلاف کی بناء لفظ ''منکم'' ہے۔ بعض مفسرین جیسے کہ جلالین میں ہے، منکم میں جو من ہے، اسے تبعیضیہ بتاتے ہیں، یعنی تم میں سے ایک گروہ، تمام امت نہیں۔ لیکن بعض دوسرے مفسرین کا جیسے کہ امام رازی اور شیخ محمد عبدہ ہیں، کہنا ہے کہ منکم میں من بیانہ ہے، یعنی دعوت إلی الخیر اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا حکم سب کے لیے ہے۔ آخرالذکر مفسرین نے اپنی اس رائے کی تائید میں قرآن کی بعض دوسری آیات پیش کی ہیں جن میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی ذمہ داری مومنین کے کسی ایک گروہ تک محدود نہیں رکھی گئی، چنانچہ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ﴾(۴۵)

''تم لوگ بہتر امت ہو کہ وہ لوگوں کے لیے ظاہر کی گئی ہے تم لوگ نیک کاموں کا حکم دیتے ہو اور بری باتوں سے روکتے ہو اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتے ہو''۔

یعنی مسلمان اس لیے بہترین امت ہیں کہ انہیں اس فرض منصبی کا ذمہ دار قرار دیا گیا ہے کہ وہ معروف کا حکم کریں۔ منکر سے روکیں اور ان کا اللہ پر ایمان ہو۔

شیخ محمد عبدہ اس بات کے ثبوت کے لیے کہ ایک دوسرے کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا سب کی ذمہ داری ہے، قرآن مجید کی حسب ذیل آیات پیش کرتے ہیں:

﴿وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ﴾(۴۶)

شیخ محمد عبدہ کے نزدیک تواصوا کے معنی امر و نہی کے ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں عیسائیوں کے خلاف یہ فرد جرم

لگائی ہے کہ "کانوا لا یتناھون عن منکر فعلوہ لبئس ما کانوا یفعلون" [۷۹۵۹] (ایک دوسرے کو برے کام سے جو وہ کام کرتے تھے، منع نہ کرتے تھے۔ البتہ برا تھا جو وہ کرتے تھے)۔

تفسیر جلالین میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی ذمہ داری تمام مومنین کے بجائے صرف ایک مخصوص گروہ تک اس لیے محدود کی گئی ہے کہ مفسرین جلالین کے نزدیک اس کے لیے معروف اور منکر کا علم ہونا ضروری ہے اور ظاہر ہے امت میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جنہیں یہ علم نہیں ہوتا لیکن امام رازی کا کہنا یہ ہے کہ المعروف والمنکر پر جو الف لام ہے وہ استغراق کا ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ ہر معروف (اچھی بات) اور ہر منکر (بری بات) پر یہ المعروف اور المنکر شامل ہے۔(۴۷) اس ضمن میں امام رازی نے یہ بھی کہا ہے:

((اعرف المعروفات الدین الحق والایمان بالتوحید والنبوۃ وانکر المنکرات الکفر باللہ))(۴۸)

"معروف باتوں میں سے سب سے بہتر دین حق ہے اور توحید ونبوت پر ایمان ہے اور منکرات میں سے سب سے بری بات اللہ سے کفر کرنا ہے"۔

قرآن مجید اور سنت میں کبھی بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے دائرے کو محدود نہیں کیا گیا اور نہ یہ کسی خاص گروہ کا فریضہ قرار دیا گیا۔ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اس پر عامل ہو۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو صرف طبقہ علماء سے مخصوص کر لینے کی مذمت کی ہے اور اسے مشرکانہ فعل بتایا ہے۔(۴۹)

قرآن مجید انسانی معاشرے کے اس روگ کو امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا حکم ہر مسلمان کے لیے لازی قرار دے کر دور کرنا چاہتا ہے۔ اس بارے میں قرآن مجید کے جو ارشادات ہیں وہ اوپر گزر چکے ہیں۔ احادیث میں بھی اس پر بہت زور دیا گیا ہے۔ ایک حدیث نبوی ہے:

((من رای منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ فان لم یستطع فبقلبہ وذالک اضعف الایمان))(۵۰)

"اگر تم میں سے کوئی بری بات دیکھے تو اسے چاہیے کہ وہ اس کو ہاتھ سے ٹھیک کر دے، اگر وہ ہاتھ سے نہیں کر سکتا تو پھر زبان سے اور اگر زبان سے نہیں تو دل سے (اسے برا

سمجھے) اور یہ ضعیف ترین ایمان ہے''۔

افسوس ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے حکم کے بارے میں ہمارے مفسرین ''منکم'' کے ضمن میں تبعیضیہ اور بیانیہ کی بحث میں پڑ گئے اور معاشرتی زندگی کی اصلاح کے سلسلے میں اس حکم کی اہمیت نظر انداز ہو گئی۔ اگر ہم ''من'' کو تبعیضیہ بھی مان لیں تو اس سے بھی لازم آتا ہے کہ مسلمانوں میں ہمیشہ ہمیشہ ایک جماعت ایسی رہنی چاہیے جو امر بالمعروف و نہی عن المنکر پر کاربند رہے اور معاشرے کی اصلاح کرتی رہے۔

بے شک قرآن مجید میں ہر شخص کو اپنی ہدایت اور گمراہی کا ذمہ دار قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا:

﴿مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِىْ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى﴾ (۵۱)

''جس نے ہدایت پائی تو وہ اپنے آپ کے لیے ہدایت پاتا ہے اور جو گمراہ ہوا تو وہ اپنے نقصان کے لیے گمراہ ہوتا ہے اور کوئی شخص کسی کا بوجھ نہیں اٹھاتا''۔

لیکن قرآن مجید میں یہ بھی ارشاد ہوا ہے:

﴿وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ﴾ (۵۲)

''یہ لوگ اپنے گناہ اور اپنے گناہوں کے ساتھ کچھ اور گناہ بھی اپنے اوپر لادے ہوئے ہوں گے''۔

مطلب یہ کہ اگر ایک شخص کسی کو کوئی برا کام کرتے دیکھتا ہے، اور وہ اسے نہیں روکتا تو اس سے لوگوں کو دھوکہ ہوتا ہے اور وہ برے کام کی برائی سے آگاہ نہیں ہو پاتے۔ اس لیے برے کام سے نہ روکنے والا بھی قابل مواخذہ ہے۔ اس لیے اسلام کا یہ حکم ماقبل اس کے کہ تمام معاشرہ فساد کی زد میں آ جائے، افراد ایک دوسرے کو معروف باتوں کا حکم دیں اور منکرات سے روکیں، اور معاشرہ کو سرتا پا فساد بننے نہ دیں۔ یہ ہیں اسلامی معاشرے کے خدوخال جن سے متعلق اصولی احکامات اور بنیادیں قرآن و احادیث میں مذکور ہیں۔

اس مقالہ میں مسلم معاشرہ کی تشکیل میں عرب کے معاشرتی و معاشی رسوم رواج کو جس حد تک برقرار رکھا گیا یا ترمیم و اضافہ کے ساتھ برقرار رکھا گیا اس کے متعلقہ حصوں میں نشاندہی کر دی گئی ہے، مثلاً نکاح و طلاق کے

مسائل و معاملات، قصاص و دیت کے احکام اور بیع و شراء کے بہت سے ایسے احکام ہیں جو دور جاہلی میں پہلے سے موجود تھے اور آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے انہیں بعینہ اسلامی معاشرہ کا جزو بنا دیا۔ بعض کو مسترد فرما دیا اور بعض کو ترمیم و اضافہ کے ساتھ قبول فرمایا۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ انسائیکلو پیڈیا آف سوشل سائنسز، جلد ۱۳، ص ۲۳۶

۲۔ ابن خلدون، المقدمہ، (مطبوعہ، بیروت)، ص ۴۹

۳۔ بنی اسرائیل ۱۷

۴۔ ان اقسام نکاح کی تفصیل اور حوالہ جات ملاحظہ فرمایئے راقم الحروف کی کتاب ''اسلامی معاشرہ کی تاسیس و تشکیل، باب دوم ''معاشرتی حالات''، ص ۲۹-۷۰

۵۔ البقرہ ۲۲۹

۶۔ عبدالکریم زیدان، احکام الذمیین والمستأمنین فی دارالاسلام، ص ۳۹۰

۷۔ جصاص، احکام القرآن، ج ۳، ص ۳۵۷

۸۔ صبحی محمصانی، الاوضاع التشریعیہ، ص ۶۰

۹۔ جصاص، احکام القرآن، ج ۱، ص ۱۶۴

۱۰۔ تفصیل کے لیے دیکھیئے، جصاص، احکام القرآن، ج ۱، ص ۴۶۴

۱۱۔ بنی اسرائیل، ۱۵

۱۲۔ شوکانی، نیل الاوطار، ج ۷، ص ۳۶-۳۷

۱۳۔ صبحی محمصانی، الاوضاع التشریعیہ، ص ۲۹

۱۴۔ الحجرات، ۱۳

۱۵۔ ایضاً

۱۶۔ الانعام ۱۳۲

۱۷۔ الاحقاف ۱۹

۱۸۔ بنی اسرائیل ۱۵

۱۹۔ الحجرات ۱۰

۲۰۔ البخاری، الجامع الصحیح، ج ۱، ص ۱۲۸

۲۱۔ الاعراف ۲۹

۲۲۔ الانعام ۱۵۲

۲۳۔ الحدید ۲۵

۲۴۔ النحل ۹۰

۲۵۔ الانعام ۱۵۲

۲۶۔ القرآن، البقرہ ۲۵۶

۲۷۔ الروم ۳، الشوریٰ ۳، النساء ۱، النساء ۱۹

۲۸۔ بنی اسرائیل ۳، البقرہ ۱۰، النساء ۶

۲۹۔ النساء ۳، البقرہ ۱۰، النساء ۶

۳۰۔ النساء ۱، آل عمران ۳، النحل ۱۳

۳۱۔ مظہر الدین صدیقی، اسلام اینڈ تھیوکریسی، (ادارہ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور ۱۹۷۸ء)، ص ۳۱

۳۲۔ حوالہ ایضاً، ص ۳۰

۳۳۔ الماعون ۴، ۷

۳۴۔ الحدید ۱۸

۳۵۔ الدہر ۹

۳۶۔ التوبہ ۳۴، ۳۵

۳۷۔ البخاری، الجامع الصحیح، کتاب النفقات باب النفقات

۳۸۔ الترمذی، السنن، باب البر، ابوداؤد، سنن، باب الادب

۳۹۔ بخاری، تفسیر سورہ الحشر ۵۹

۴۰۔ البخاری، الجامع الصحیح، دار ابن کثیر (دمشق، بیروت)، ج ۱، ص ۵

۴۱۔ البقرہ ۱۷۷

۴۲۔ الحشر ۹

۴۳۔ التوبہ ۶۰

۴۴۔ آل عمران ۱۰۴، ۱۰۵

۴۵۔ آل عمران ۱۱۰

۴۶۔ القرآن، العصر ۱، ۳

۴۷۔ فخر الدین الرازی، تفسیر الکبیر، (مطبع بھیہ المصریہ، قاہرہ ت۔ل)، ج ۳، ص ۲۶

۴۸۔ فخر الدین رازی، مفاتح الغیب ص ۲۷

۴۹۔ ابوالکلام آزاد، امر بالمعروف، (مطبوعہ ہلال بک ایجنسی، دہلی ت۔ن)

۵۰۔ مسلم، الالجامع صحیح، کتاب الایمان، باب الایمان

۵۱۔ بنی اسرائیل ۱۵

۵۲۔ العنکبوت ۱۳